کیا صحابہ کرامؓ معیارِ حق ہیں؟

—— ملک غلام علی صاحب ——

جماعت اسلامی کے خلاف جو بے سروپا اور خلافِ واقعہ الزامات عائد کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "یہ جماعت صحابۂ کرام کو معیارِ حق نہیں مانتی اور ان پر تنقید کو جائز رکھتی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو صحابۂ کرام کی عیب چینی سے منع فرمایا گیا ہے اور قرآن و حدیث صحابہؓ کے فضائل و مناقب سے لبریز ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں، جس کی بھی تم پیروی کروگے راہ پاؤگے"

جماعتِ اسلامی سے وابستگی رکھنے والا ہر شخص اگرچہ اللہ کے فضل و کرم سے ایک سچے مسلمان کی طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس انسانی گروہ کے لیے سب سے زیادہ محبت و تعظیم کے جذبات اپنے دل میں رکھتا ہے، وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی کی جماعت ہے اور وہ اپنی حد تک اس غلط الزام سے اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتا ہے، تاہم عامۃ المسلمین کو بدگمانی سے بچانے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کو واضح کیا جائے اور بتایا جائے کہ جماعتِ اسلامی کا موقف اس مسئلے میں کیا ہے اور آیا وہ کتاب و سنّت اور ائمۂ سلف کے مسلّمہ مسلک کے مطابق ہے یا ان کے مخالف۔ اس وضاحت سے امید ہے کہ جماعت کے افراد کو بھی اطمینانِ قلب حاصل ہوگا اور معترضین کا بھی اگر منہ بند نہ ہوگا تو کم از کم عام مسلمانوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا امکان باقی نہ رہے گا۔ اسی غرض کو سامنے رکھ کر یہاں چند ضروری تصریحات پیش کی جا رہی ہیں۔

دستورِ جماعت کی اصل عبارت جماعت اسلامی کے خلاف مندرجہ بالا الزام کی بنیاد جماعت کے دستور کی ایک عبارت پر رکھی جاتی ہے جس کے پورے الفاظ بھی معترضین نقل نہیں کرتے بلکہ ایک دو

فقروں کو سیاقِ عبارت سے الگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید بحث سے قبل دستورِ جماعتِ اسلامی کی وہ پوری عبارت یہاں نقل کر دی جائے جس کو بنیاد بنا کر یہ اعتراض بار بار اٹھایا جاتا ہے۔ دستورِ جماعت کی دفعہ ۳ کی متعلقہ شق ۱ درج ذیل ہے:

"رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بناتے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔"

بس یہی وہ عبارت ہے جس سے وہ سارا الزام برآمد کیا گیا ہے حالانکہ اس میں یہ بات سرے سے مذکور ہی نہیں ہے کہ صحابہ کرام کی جماعت پر تنقید ہو سکتی ہے یا نہیں، بلکہ اس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ اصل معیارِ حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کے اندر سے معنی آفرینی اور حاشیہ آرائی کر کے یہ بات معترضین نے خود نکالی ہے کہ نبی کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھنے سے صحابہ پر تنقید کا جواز لازم آتا ہے لہٰذا جماعت اسلامی اس کی قائل ہے۔ پھر تنقید کو تنقیص اور عیب چینی کا ہم معنی بھی خود معترضین ہی نے بنایا ہے تاکہ ہم پر یہ الزام چسپاں کیا جا سکے کہ ہم صحابہ کی عیب چینی کو جائز سمجھتے ہیں اور اس کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد معترضین کا مزید کرتب یہ ہے کہ وہ اس عبارت کا یہ فقرہ صاف نظر انداز کر جاتے ہیں کہ "جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو اس کو اسی درجے میں رکھے"۔ چونکہ یہ فقرہ ان کے اعتراضات کی پوری بنیاد ہی کو منہدم کر دیتا ہے، اس لیے وہ سرے سے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں کرتے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان حضرات پر الزام تراشی کا شوق کس قدر غالب ہے اور ان کے لیے دوسروں کے دین و ایمان میں کیڑے ڈالنا کس طرح ایک محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔

امیرِ جماعت کی تشریحات اس پر مزید ستم یہ ہے کہ ان لوگوں کی اس الزام تراشی کے جواب میں مذکورۂ بالا عبارت کی جو تشریح بارہا کی گئی ہے، اس سے انہوں نے ہمیشہ آنکھیں بند رکھی ہیں اور اپنے اصل اعتراض ہی کو بار بار دُہراتے اور پھیلاتے چلے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے، دستور کی اس شق اور بالخصوص اس کے الفاظ "معیارِ حق" اور "تنقید" کی تشریح جماعتِ اسلامی پاکستان کے موجودہ امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

نے بعض سوالات کا جواب دیتے ہوئے یوں کی ہے:

"ہمارے نزدیک معیارِ حق سے مراد وہ چیز ہے جس سے مطابقت رکھنا حق ہو اور جس کے خلاف ہونا باطل ہو۔ اس لحاظ سے معیارِ حق صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ صحابۂ کرام معیارِ حق نہیں ہیں بلکہ کتاب و سنت کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ کتاب و سنت کے معیار پر جانچ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ گروہ برحق ہے۔ ان کے اجماع کو ہم اسی بنا پر حجت مانتے ہیں کہ ان کا کتاب و سنت کی ادنیٰ سی خلاف ورزی پر بھی متفق ہو جانا ہمارے نزدیک ممکن نہیں ہے۔"

(ترجمان القرآن، رسائل و مسائل جلد ۵۶، عدد ۵)

پھر ایک دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں:

"تنقید کے معنی عیب چینی ایک جاہل آدمی تو سمجھ سکتا ہے مگر کسی صاحبِ علم آدمی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس لفظ کا یہ مفہوم سمجھے گا۔ تنقید کے معنی جانچنے اور پرکھنے کے ہیں اور خود دستور کی مذکورۂ بالا عبارت میں اس معنی کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد عیب چینی مراد لینے کی گنجائش صرف ایک فتنہ پرداز آدمی ہی اس لفظ سے نکال سکتا ہے۔ مزید برآں اس فقرے میں یہ تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ رسولِ خدا کو معیار قرار دینے کے بعد جس کا جو مرتبہ بھی اس لحاظ سے قرار پائے گا، اسے اسی درجہ میں رکھا جائے گا۔ اس سے یہ مطلب آخر کیسے نکل آیا کہ صحابۂ کرام کے جو محامد و فضائل کتاب اللہ اور احادیثِ نبویہ میں مذکور ہیں، وہ واجب التسلیم نہیں ہیں؟"

(رسالہ "کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟")

جماعت اسلامی کے دستور کی مندرجۂ بالا عبارت اور اس کی پیش کردہ وضاحت سلیس اور عام فہم ہے اور ہر پڑھا لکھا آدمی اس کو پڑھ کر بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ آیا اس سے صحابۂ کرام کی تنقیص و توہین کا پہلو نکلتا ہے یا اس سے ان کی تعظیم و توقیر ثابت ہوتی ہے۔ اس عبارت میں اگر لفظ تنقید استعمال ہوا ہے تو اسے خواہ مخواہ ہوا بنا لینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اس لفظ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم فقط یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت و ماہیت کو جانچا جائے۔ اگر وہ شے فی الاصل زرِ خالص اور کامل العیار ہے تو معیار

پرکسے جانے کے بعد اس کا جوہرِ حسن و کمال اور زیادہ نکھر جائے گا۔

قرآن کا فیصلہ کتاب و سنّت کے بموجب صحابہ کرام کے من حیث الجماعت واجب الاحترام ہونے اور اجماع صحابہ کے حجّتِ شرعی تسلیم کیے جانے کے بعد اس ضمن میں ایک مسئلہ بحث طلب رہ جاتا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایک ایک صحابی کے منفرد قول و فعل یا چند صحابہ کے مختلف اقوال کا شمار ادلّۂ شرعیہ میں ہو سکتا ہے یا نہیں اور کتاب و سنّت کی کسوٹی پر جانچے بغیر بلا تنقید اور بے چون و چرا محض قول و فعلِ صحابی ہونے کی بنا پر انہیں واجب التقلید سمجھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں جب ہم سب سے پہلے کتاب اللہ کی جانب رجوع کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کسی مقام پر بھی صحابہ کرام کے انفرادی افعال و اعمال کو ہمارے لیے مستقل اسوہ اور مرجع قرار نہیں دیا گیا بلکہ تمام مسلمانوں کے ساتھ خود صحابہ کرام کو بھی یہ تعلیم فرمائی گئی ہے کہ جب کسی معاملے میں تمہارے درمیان تنازُع اور اختلاف پیدا ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی جانب لوٹاؤ۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ۔ اس ارشادِ ربانی کے اوّلین مخاطب خود صحابۂ کرام ہی ہیں۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ ہی یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ ایک ایک صحابی بجائے خود معیارِ حق نہیں ہے بلکہ اختلاف کی صورت میں صحابہ کے لیے بھی مرجع کتاب و سنّت ہی ہے۔

حدیث کا فیصلہ قرآن مجید کے بعد جب ہم حدیثِ رسولؐ سے رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں صحابۂ کرام کے انفرادی اقوال و افعال کے واجب الاتباع ہونے پر کوئی دلیل نہیں ملتی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض احادیث میں وارد ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میرے بعد ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کی اقتدا کرو۔ لیکن اس سے مراد ان کی ذاتی حیثیت میں مطلقاً پیروی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد خلیفۂ راشد ہونے کی حیثیت سے ان کی اس سنّت کی پیروی ہے جسے اجماع صحابہ کی تائید و توثیق حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو یہ دونوں بزرگ دوسرے صحابہ کو اپنی آراء پر بحث و کلام کی دعوت، اور اپنے خیالات سے اختلاف کی اجازت نہ دیتے، اور خود صحابہ بھی ان سے اختلاف کی جرأت نہ کرتے۔

حدیث اصحابی کالنجوم کی تحقیق اقتدائے شیخین سے متعلق ان احادیث کے علاوہ صرف ایک روایت

ایسی پائی جاتی ہے جس سے بظاہر صحابۂ کرام کے منفرد اقوال کی حجیت کے حق میں استدلال ہو سکتا ہے۔ یہ روایت بالعموم اس طرح بیان کی جاتی ہے: اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو گے راستہ پاؤ گے)۔ اگرچہ اصول فقہ کی کتابوں میں اس روایت کا جا بجا ذکر کیا جاتا ہے لیکن میرے علم میں کوئی ایک اصولی یا فقیہ بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس روایت سے صحابی کے قول و عمل کو مطلقاً حجت ثابت کرنے کی کوشش کی ہو۔ علمائے اصول اس روایت کی کچھ دوسری تاویلات کرتے ہیں جن کے ذکر کا یہاں موقع اور محل نہیں ہے۔

اس روایت اور اس سے ملتے جلتے الفاظ پر مشتمل بعض دیگر روایات جو صحابہ اور اہلِ بیت کے حق میں مروی ہیں، ان کے متعلق جو اوّلین اور ضروری بات قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ محدثین اور فنِ رجال کے ماہرین کے نزدیک ان سب کی سند نہایت کمزور ہے، اس لیے عقائد و احکام کی بحث میں ان سے استدلال جائز نہیں ہے، بلکہ فضائل و مناقب کے سلسلے میں بھی ان کے ضعف کی صراحت کیے بغیر ان کا بیان کرنا صحیح نہیں ہے۔ صحاح ستہ یا حدیث کی کسی دوسری مستند کتاب میں ان کی تخریج نہیں کی گئی۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں روایت مذکورۂ بالا کی سند کو نقل کر کے لکھا ہے: ھٰذا اسناد لاتقوم بہ حجّۃ (یہ ایسی سند ہے جس کے بل پر کوئی حجت قائم نہیں ہوتی)۔ ابن حزم نے الاحکام میں اس کے راویوں پر جرح کرنے کے بعد لکھا ہے: ھٰذہ روایۃ ساقطۃ۔ خبر مکذوب موضوع باطل لم یصح قطّ۔ (یہ پایۂ اعتبار سے گری ہوئی روایت ہے۔ ایک جھوٹی اور موضوع اور باطل خبر ہے جو صحیح ثابت نہیں ہوئی)۔

حافظ ابن حجر نے تخریج کشاف میں اس روایت اور دیگر متقارب الالفاظ روایات کی ساری سندوں کا ذکر کر کے انہیں ضعیف اور واہی قرار دیا ہے۔ امام شوکانی نے ارشاد الفحول ص۸۳ میں اجماع پر بحث کرتے ہوئے یہ حدیث نقل کی ہے اور پھر لکھا ہے: فیہ مقال معروف اور تصریح کی ہے کہ اس کا ایک راوی نہایت ضعیف اور دوسرا ابن معین کے نزدیک کذّاب ہے اور امام بخاریؒ کے نزدیک متروک ہے۔ ایک دوسرے طریقے کے راوی کو ابو حاتم نے ضعیف جدّاً اور بخاریؒ نے منکر الحدیث کہا ہے

(امام بخاریؒ کے ہاں جرح کے یہ الفاظ انتہائی سخت ہیں)۔ ابن معین نے اس کے متعلق کہا ہے لاشیٔ (یہ راوی ایک کوڑی کا بھی نہیں)۔ ابن عدی نے اس راوی کی روایات کو موضوع قرار دیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین، جلد ثانی، القول فی التقلید میں اس روایت کے غیر صحیح ثابت کیا ہے۔

قول صحابی کے متعلق ائمہ سلف کا مسلک بہرکیف قولِ صحابی کے حجت ہونے پر کتاب و سنت میں کوئی نص موجود نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ امت کا اس مسئلے میں تقریباً اتفاق ہے کہ اگر کسی معاملے میں صرف ایک یا چند صحابہ کا عمل یا قول ہی ماثور ہو تو اس کا شمار ادلہ شرعیہ میں نہیں ہو سکتا، چاہے اس کے خلاف کوئی دوسرا قولِ صحابی موجود نہ ہو اسے کتاب و سنت کی کسوٹی پر جانچنا ناگزیر ہوگا۔ اسی طرح جن مسائل میں صحابہ کرام کے مابین اختلاف رونما ہوا ہے، وہاں بھی لامحالہ چھان بین اور تحقیق و ترجیح کی ضرورت لاحق ہوگی اور جو قول کتاب و سنت کے اصل معیار کے جتنا زیادہ مطابق ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ قابلِ اخذ و ترجیح ہوگا اور اس کے بالمقابل دوسرا قول قابلِ ترک ہوگا۔ اسی تحقیق و تفتیش اور جانچ پڑتال کا دوسرا نام تنقید ہے۔ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند مستند ائمہ و فقہاء کے اقوال و آراء کو یہاں نقل کر دیا جائے۔

حنفیہ کا مسلک امام ابوحنیفہؒ کے دو اقوال اگست ۶۳ء کے ترجمان میں مستند حوالوں سے نقل ہو چکے ہیں ایک قول یہ ہے کہ "جب مجھے کتاب و سنت میں کوئی حکم نہیں ملتا تو میں اجماعِ صحابہؓ کی پیروی کرتا ہوں اور اختلاف کی صورت میں جس صحابی کا قول چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں" دوسرا قول یہ ہے کہ "جب صحابہؓ میں اختلاف ہو تو قیاس کرتا ہوں"

مذہب حنفی کے نامور فقیہ شمس الائمہ امام سرخسیؒ اپنی کتاب الاصول جلد اول میں اجماع صحابہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وانما کان الاجماع حجۃ باعتبار ظھور	اور اجماع کا حجت ہونا اس وجہ سے ہے کہ ایک بات
وجہ الصواب فیہ بالاجتماع علیہ وانما	پر اتفاق ہو جانے کے باعث حق و صواب کا پہلو
یظھر ھذا فی قول الجماعۃ لا فی قول الواحد	واضح ہو جاتا ہے۔ یہ بات قولِ واحد کے معاملے
الا تری ان قول الواحد لا یکون موجبا	میں نہیں بلکہ قول جماعت ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔
للعلم وان لم یکن بمقابلتہ جماعۃ یخالفونہ	کیا تم نہیں دیکھتے کہ قولِ واحد اس صورت میں بھی

موجبِ علم نہیں ہوتا جبکہ کسی جماعت نے اسکی مخالفت نہ کی ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ قولِ منفرد حجت نہیں ہے، خواہ اس سے مختلف یا اس کی مخالفت میں کوئی دوسرا قول موجود ہو یا نہ ہو۔ اسی جلد کے آخری دو صفحات میں امام مذکور نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ صحابی اگر یوں کہے کہ اُمرنا بکذا او نُھینا عن کذا او السنّۃ ھٰکذا (ہمیں اس کا حکم دیا گیا یا اس سے منع کیا گیا ہے یا سنّت یہی ہے) تب بھی صحابی کے ایسا فرمانے سے اس فعل کا امرِ رسول یا سنّتِ رسول ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کسی خاص امیر کے حکم یا کسی خاص شہر یا علاقے کے عمل یا طریقے کا ذکر ہو۔

پھر امام سرخسی اسی کتاب کی جلد دوم ص۱۰۵ پر ایک فصل کا عنوان قائم کرتے ہیں: فصلٌ فی تقلید الصحابی اذا قال قولاً ولا یعرف لہ مخالف۔ اس باب میں بھی وہ صحابی کے ایسے قول کی تقلید و عدمِ تقلید پر بحث فرماتے ہیں جس کے مخالف کوئی دوسرا قولِ صحابی معلوم و معروف نہیں ہے۔ اس عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

قد ظھر من الصحابۃ الفتوی بالرائ ظھورًا لا یمکن انکارہ والرائ قد یخطی فکان فتوی الواحد منھم محتملاً مترددًا بین الصواب والخطاء ولا یجوز ترك الرأی بمثلہ کما لا یترك بقول التابعی۔	صحابہ سے رائے کی بنا پر بعض فتوے صادر ہوتے ہیں۔ یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور رائے کبھی غلط بھی ہوتی ہے۔ پس صحابہ کے انفرادی فتویٰ میں صواب و خطا دونوں کا احتمال ہے۔ اس طرح کے فتوے کے بالمقابل رائے کو ترک کرنا جائز نہیں، جس طرح قیاس و رائے کو تابعی کے قول کے مقابلے میں ترک کرنا جائز نہیں۔

آگے چل کر امام سرخسی نے مسلکِ احناف کی جو تفصیل بیان کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب قولِ صحابی کسی ایسے معاملے سے متعلق ہو جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کا امکان ہو، وہاں صحابی کے فتوے کو اپنی رائے پر ترجیح دی جائے گی۔ مثال کے طور پر جس مسئلے میں قیاس کو دخل نہ ہو یا صحابی کا قول جس مسئلے میں خلافِ قیاس ہو، یعنی عام قیاس جس بات کا مقتضی ہو، صحابی کا قول اس کے

مخالف ہو۔ اس طرح کے مسئلے میں قولِ صحابی ہی کو مقدم سمجھا جائے گا اور قیاس کو ترک کیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابی کے غیر قیاسی یا خلافِ قیاس قول کے معاملے میں زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ قول صاحبِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہوگا اور صحابی نے اپنے جی سے یہ بات نہیں کہی ہوگی۔ اس قول کا قبول کیا جانا مجرد قولِ صحابی ہونے کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر ہے کہ اس کے قولِ رسولؐ ہونے کا قرینہ اور احتمال موجود ہے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ حنفیہ نے قولِ صحابی کے بارے میں مُدرَک بالقیاس اور غیر مدرک بالقیاس، مطابق اور مخالفِ قیاس کی یہ جو تفریق قائم کی ہے، اور جس کی بنا پر ایک قسم کے قولِ صحابی کو اپنے اجتہاد پر ترجیح دی ہے اور دوسری قسم میں اجتہاد کو قولِ صحابی پر مقدم رکھا ہے، یہ تفریق و ترجیح بھی درحقیقت تنقید ہی کی ایک شکل ہے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ اوپر کی یہ ساری بحث صحابی کے اس قول و فعل سے متعلق ہے جس کے خلاف کسی دوسرے صحابی کا قول و فعل موجود نہ ہو۔ جہاں صحابہ کے قول و عمل میں اختلاف موجود ہوگا وہاں تو بہرحال ترک و اختیار کے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ یہاں بھی آخر ترجیح بلا مرجح کا اصول تو نہیں چلے گا بلکہ کتاب و سنت سے اقرب و اوفق قول ہی کو قولِ مختار قرار دینا پڑے گا۔ دوسرے لفظوں میں صاحبِ اجتہاد کو اس صورت میں بھی تقلید کے بجائے تنقید و ترجیح کے مسلک ہی پر کاربند ہونا ہوگا۔

شافعیہ کا مسلک اس کے بعد اب مسلکِ شافعی کو لیجیے۔ امام غزالی، المستصفی، جزء اول ص۱۳۵ میں باب الاصل الثانی من الاصول الموہومہ۔ قول الصحابی کے تحت بحث کرتے ہوئے پہلے فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک مذہبِ صحابی علی الاطلاق حجت ہے، بعض کے نزدیک غیر قیاسی مسائل میں حجت ہے اور بعض کے نزدیک صرف حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا قول حجت ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں:

والکل باطل عندنا۔ فان من یجوز علیه الغلط والسھو ولم یثبت عصمتهٗ فلا حجة فی قوله۔ فکیف یحتج بقولھم مع جواز	ہمارے نزدیک (مذہبِ صحابی کی حجیت کے حق میں) یہ سارے اقوال باطل ہیں۔ جس انسان کو غلطی اور سہو لاحق ہونا ممکن ہو اور جس کے لیے عصمت ثابت نہ ہو

الخطاء وکیف تدعی عصمتہم من غیر حجۃ متواترۃ وکیف یتصور عصمۃ قوم یجوز علیہم الاختلاف ؟ وکیف یختلف المعصومان کیف وقد اتفقت الصحابۃ علی جواز مخالفۃ الصحابہ فلم ینکر ابوبکر وعمر علی من خالفھما بالاجتہاد - بل اوجبوا فی مسائل الاجتہاد علی کل مجتہد ان یتبع اجتہاد نفسہ - فانتفاء الدلیل علی العصمۃ ووقوع اختلاف بینھم وتصریحہم بجواز مخالفتہم فیہ ثلاثۃ ادلۃ قاطعۃ -

اس کے قول میں کوئی حجت نہیں۔ پس صحابہ کے قول سے کیسے سند پکڑی جا سکتی ہے جبکہ ان سے خطا کا صدور جائز ہے۔ کسی حجت متواترہ کے بغیر ان کی عصمت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے اور اس گروہ کو کیسے معصوم متصور کیا جا سکتا ہے جس میں اختلاف واقع ہو؟ آخر دو معصوموں کے مابین کیسے اختلاف ممکن ہے؟ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے جبکہ صحابہ نے خود صحابہ سے اختلاف کے جواز پر اتفاق کیا ہے اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے اپنے خلاف اجتہاد کرنے والوں پر نکیر نہیں کی بلکہ مسائلِ اجتہاد میں ہر مجتہد پر اس کے اپنے اجتہاد کی پیروی لازم کی ہے۔ صحابہ کے معصوم ہونے پر کوئی دلیل نہ ہونا، اور ان کے درمیان اختلاف کا پایا جانا اور ان کا خود اس امر کی تصریح کرنا کہ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، یہ تین باتیں ایسی ہیں جو ہمارے مسلک کے حق میں دلیل قاطع ہیں۔

اس کے بعد امام غزالیؒ نے امام شافعی کے دو قول نقل کیے ہیں۔ پہلے ان کا قول یہ تھا کہ اگر صحابی کا قول مشہور ہو جائے اور اس کے خلاف کوئی قول منقول نہ ہو تو صحابی کی تقلید جائز ہے (واجب نہیں)۔ بعد میں اس قول سے رجوع کرتے ہوئے آخری اور جدید مسلک جس کے امام شافعی قائل ہوئے یہ ہے کہ:

لا یقلد العالم صحابیاً کما لا یقلد عالماً آخر۔

عالم کسی صحابی کی تقلید نہ کرے، جس طرح وہ کسی دوسرے عالم کی تقلید نہ کرے۔

پھر امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

وھو الصحیح المختار عندنا اذکل ما دل علی تحریم التقلید العالم العالم لا یفرق

یہی بات ہمارے نزدیک صحیح اور قابلِ اختیار و ترجیح ہے کیونکہ ایک عالم کے لیے دوسرے عالم کی تقلید

فیه بین الصحابی وغیرہ ۔ فی الجملہ جن دلائل کی بنا پر حرام ہے ، ان کے لحاظ سے صحابی اور غیر صحابی میں فرق نہیں کیا جا سکتا ۔

اس کے بعد امام غزالی ان اصحاب کے دلائل کا ذکر کرتے ہیں جو فضائل صحابہ پر مشتمل آیات و احادیث سے تقلیدِ صحابہ کو جائز یا لازم سمجھتے ہیں اور اس کے جواب میں فرماتے ہیں :

قلنا هذا كله ثناء يوجب حسن الاعتقاد فی علمہم ودینہم ومحلہم عند اللہ تعالیٰ ولا یوجب تقلیدھم لا جوازاً ولا وجوباً

ہم کہتے ہیں کہ یہ تمام ثنا ہے جس سے صحابہ کرام کے علم ، دین اور اللہ کے ہاں ان کے مرتبے کے بارے میں حسن اعتقاد لازم آتا ہے ۔ لیکن اس سے ان کی تقلید کا نہ جواز لازم آتا ہے نہ وجوب ۔

پھر یہ جواب ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :

کل ذالک ثناء لا یوجب الاقتداء اصلاً

یہ سب تعریف و منقبت ہے ۔ اس سے اقتدا بالکل لازم نہیں ہوتی ۔

علامہ سیف الدین آمدی کی رائے جسے انہوں نے "الاحکام فی اصول الاحکام" جزء ثالث مذہب الصحابی کے آغاز بحث میں بیان کیا ہے یہ ہے کہ غیر صحابی کے لیے قولِ صحابی کے حجت ہونے میں اختلاف ہے ۔ اشاعرہ معتزلہ ، امام شافعی اور امام ابن حنبل کے ایک قول کے مطابق اور امام ابوالحسن حنفی کے نزدیک قولِ صحابی حجت نہیں ہے ۔ بعض کے نزدیک مخالفِ قیاس قول حجت ہے اور بعض کے نزدیک قول ابی بکر و عمر حجت ہے ۔

پھر فرماتے ہیں :

والمختار انه لیس بحجة مطلقاً

قول مختار یہ ہے کہ قول صحابی ہرگز حجت نہیں ۔

آگے چل کر المسئلۃ الثانیہ کے زیر عنوان علامہ موصوف یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ "جب یہ ثابت ہو گیا کہ مذہبِ صحابی حجتِ واجب الاتباع نہیں تو کیا غیر صحابی کے لیے اس کی تقلید جائز بھی ہے ؟ پھر اس کا جواب یہ دیتے ہیں :

والمختار امتناع ذالک مطلقاً

قابلِ ترجیح مسلک یہ ہے کہ تابعین و مجتہدین کے لیے

صحابی کی تقلید مطلقاً ممنوع ہے

امام شوکانی امام شوکانی ارشاد الفحول، الفصل السابع فی الاستدلال، البحث الخامس، فی قول الصحابی میں اپنی تحقیق ان الفاظ میں درج کرتے ہیں:

والحق انہ لیس بحجۃ فان اللہ سبحانہ لم یبعث الی ھذہ الامۃ الا نبینا محمداً صلی اللہ علیہ وسلم ولیس لنا الا رسول واحد وکتاب واحد وجمیع الامۃ مأمور باتباع کتابہ وسنۃ نبیہ والفرق بین الصحابۃ ومن بعدھم فی ذالک فکلھم مکلفون بالتکالیف الشرعیۃ وباتباع الکتاب والسنۃ فمن قال انما تقوم الحجۃ فی دین اللہ عزوجل بغیر کتاب اللہ وسنۃ رسولہ وما یرجع الیھما فقد قال فی دین اللہ بما لا یثبت۔

حق یہ ہے کہ قولِ صحابی حجت نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ نے اس امت کی طرف صرف ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے۔ ہمارے لیے بس ایک ہی رسول اور ایک ہی کتاب ہے۔ تمام امت اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنّت کے اتباع پر مامور ہے اور اس معاملے میں صحابہ اور غیر صحابہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ سب کے سب تکالیفِ شرعیہ اور اتباعِ کتاب و سنّت کے مکلف ہیں۔ جس شخص نے یہ کہا ہے کہ اللہ کے دین میں کتاب و سُنّت یا جو کچھ ان دونوں کی طرف راجع ہوتا ہے، اس کے سوا کسی اور چیز سے بھی حجت قائم ہو سکتی ہے، اس نے دین کے معاملے میں ایک بے ثبوت بات کہی۔

شاہ ولی اللہ حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ قسم اوّل کے اواخر میں التنبیہ علی مسائل کے عنوان سے ایک فصل کے تحت فرماتے ہیں:

قد صح اجماع الصحابۃ کلھم اولھم عن آخرھم واجماع التابعین اولھم عن آخرھم واجماع تابعی التابعین اولھم عن آخرھم علی الامتناع والمنع من ان یقصد منھم احدٌ الی قول انسان منھم او ممن قبلھم

صحابہ کا از اوّل تا آخر اور تابعین کا از اوّل تا آخر اور تبع تابعین کا بھی از اوّل تا آخر اس بات پر کامل اتفاق ثابت ہے کہ یہ بات ممنوع اور ممتنع ہے کہ ان سب میں سے کوئی ایک فرد بھی خود ان میں سے یا ان سے

فیاخذہ کلہ۔ | پہلے لوگوں میں سے کسی انسان کے قول کا قصد کرے اور اُسے کلّی طور پر قبول کرے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے الیواقیت والجواہر سے ائمہ مذاہب کے اقوالِ ذیل نقل کیے ہیں:

امام مالک: ما من احد الا وھو ماخوذ من کلامه ومردود علیه الا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔ | کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کے کلام کا کچھ حصّہ قابلِ قبول اور کچھ حصّہ قابلِ ردّ نہ ہو، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے۔

امام شافعی: لا حجة فی قول احد دون رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ماسوا کسی شخص کے قول میں کوئی حجت نہیں ہے۔

امام ابن حنبل: لیس لاحدٍ مع اللہ و رسوله کلام | کسی کی بات اللہ اور اس کے رسول کی بات کے برابر اور ہم پلّہ نہیں۔

یہ مختصر بحث اور چند حوالہ جات اس حقیقت کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہیں کہ دین میں واجب التسلیم حجت و سند کتاب و سنّت ہے یا پھر اجماعِ صحابہ۔ ایک صحابی یا چند صحابہ کرام کے اقوال و افعال کو کتاب و سنّت اور اجماعِ صحابہ کی طرح حجتِ قطعیہ اور تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا جا سکتا اور ان سے غیر مشروط تمسک نہیں کیا جا سکتا۔ جماعت اسلامی کے دستور میں جو اصولی بات بیان کی گئی ہے اس کے اندر سے نتیجۃً بھی اگر کوئی مزید بات نکالی جا سکتی ہے تو وہ بس اتنی ہی ہے اور بجائے خود یہ بات بالکل صحیح و صائب ہے۔ اس سے نہ تنقیصِ صحابہ لازم آتی ہے، نہ اس سے مسلکِ سلف کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ دستورِ جماعت محض عقیدہ و نظریہ کی حد تک ارکان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ نبی اور غیر نبی کے مابین امتیاز کریں اور غیر نبی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھیں۔ اس سے زبردستی یہ مطلب نکالنا صریح زیادتی ہے کہ جماعت کے ہر کس و ناکس کے لیے یہ ضروری یا جائز ہو گیا ہے کہ وہ صحابہ کے انفرادی یا مختلف فیہ مسائل میں طبع آزمائی کرے۔ دستور میں اس عبارت کے اندراج اور جماعت کے قیام پر پورے بائیس ۲۲ سال گزر چکے ہیں لیکن کوئی ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ کسی رُکنِ جماعت نے اس عبارت

سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کسی صحابی کے قول و فعل کے معاملے میں توہین آمیز طریقے پر لب کشائی کی ہو، یا صحابۂ کرام کی جناب میں کوئی دوسری ادنیٰ سی منافیٔ احترام حرکت ہی کی ہو۔ البتہ ہمارے حلقۂ معترضین میں ایسی مثالیں پائی گئی ہیں کہ بوذرثانی جیسے القاب لوگوں کو عطا کیے گئے ہیں اور ایسا لقب دینے اور لینے والوں کو اس میں صحابۂ کرام کی توہین و استخفاف کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیا۔

سطورِ بالا میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ مدعا ہرگز نہیں ہے کہ صحابۂ کرام کے آثار و اقوال کسی درجے میں بھی قابلِ اعتنا نہیں ہیں اور ان سے ہمیں سرے سے کوئی رہنمائی ہی نہیں مل سکتی۔ اوپر جن بزرگوں کے اقوال نقل کیے گئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو آثارِ صحابہ کو بالکل اٹھا کر پھینک دینے کا قائل ہو، اور نہ یہ جماعتِ اسلامی کے کسی فرد کا مسلک یا نقطۂ نظر ہے۔ جماعتِ اسلامی کا لٹریچر جس شخص کی نظر میں ہو، وہ خود بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس میں مختلف مسائلِ حیات کے متعلق اسلام کا نظریہ پیش کرنے کے لیے کتاب و سنت کے ساتھ آثارِ صحابہ ہی سے نہیں بلکہ اقوالِ تابعین و محدثین و ائمۂ مجتہدین سے بھی استشہاد کیا گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ سارا ذخیرہ ہمارا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ اور ورثہ ہے جس سے ہم کبھی بھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ بحث جو کچھ ہے وہ فقط اس امر میں ہے کہ آیا صحابی کا ہر قول بجائے خود کتاب و سنت کی طرح واجب الاتباع ہے یا اُسے اخذ کرنے سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کتاب و سنت سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے۔